عصمت چغتائی

اردو کی خواتین نثر نگاروں میں عصمت چغتائی کا نام بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے متعدد افسانے اور ناول لکھے ہیں۔ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے رہا ہے جس نے ادب اور زندگی کے براہ راست رابطے پر زور دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ادب خارجی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ ادب ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا صرف ترجمان نہیں ہوتا بلکہ ہمارے مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے۔

عصمت چغتائی نے بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ اُن میں جنسی نفسیات ایک ایسا موضوع ہے جس پر قلم اٹھاتے ہوئے بہت سے فنکار خود جذبات کا شکار ہو جاتے ہیں مگر عصمت چغتائی نے اس موضوع کو بڑے معروضی انداز میں پیش کیا ہے اور کہیں بھی خود جذباتیت کی شکار نہیں ہوئی ہیں۔ عصمت نے معاشرے میں عہدے، منصب، دولت و ثروت اور خاندانی وجاہت کے بہانے عیش پرستی کرنے اور کمزور طبقے کا استحصال کرنے والے افراد کے پول کھول دیے ہیں۔ افسانوں کی طرح ان کی خودنوشت میں بھی بے باکی، بے خوفی، جرأت اور انفرادیت موجود ہے۔

عصمت 1910 میں بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام میرزا قسیم بیگ چغتائی تھا۔ والدہ کا نام نصرت خانم تھا۔ عصمت کے سات افسانوی مجموعوں کے علاوہ کئی ناول شائع ہو چکے ہیں۔ چھوئی موئی، بدن کی خوشبو، لحاف، ضدی، ٹیڑھی لکیر، سودائی اور ایک قطرۂ خون، ان کی مشہور تخلیقات ہیں۔ ان کا انتقال 1991 میں ہوا۔

میرا ادبی سفر

ددھیال والوں کا خیال تھا کہ میں پورم پور اپنی ننھیال والوں پر گئی ہوں۔ نگوڑے شیخ پتلی دال کھانے والے، مگر ننھیال والوں کو یقین تھا کہ میں سو فیصدی ددھیال والوں پر پڑی ہوں۔ وہی اپنی پھوپی جیسا تیہا اور گز بھر کی زبان۔ چنگیز خاں کی اولاد سے اور کیا امید کی جاسکتی ہے۔

لیکن اگر کوئی اماں سے پوچھتا کہ بیٹی کو کیا ہوگیا تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں۔ 'نہ ددھیال کا قصور نہ ننھیال کا، یہ سب نصیب کا پھیر ہے۔'

ایسی صورت میں کس کا نام لے دوں۔ وہ بیج جس سے میری ہستی وجود میں آئی قطعی ٹیڑھا میڑھا نہ تھا۔ ضرور پالنے پوسنے میں کہیں بھول چوک ہوگی۔

مگر مجھے بذات خود اس ماحول سے کوئی شکایت نہیں، جہاں میری تراش خراش ہوئی۔ کچر پچر بچوں کے جم غفیر میں ایک پاپیادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی۔ نہ لاڈ ہوئے نہ نخرے، نہ کبھی تعویذ گنڈے بندھے نہ نظر اتاری گئی۔ نہ خود کو کبھی کسی کی زندگی کا اہم حصہ محسوس کیا۔

بہنیں چونکہ بڑی نکل گئیں اس لیے بھائیوں کی صف میں جگہ ملی۔ کھیل کود کا زمانہ انہیں کے ساتھ گلی ڈنڈا، فٹ بال اور ہاکی کھیل کر گزرا۔ پڑھائی بھی ان کے ساتھ ہی ہوئی۔ سچ پوچھیے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے۔ جن کی صحبت نے مجھے آزادی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ شرم و حیا جو عام طور پر درمیانہ طبقہ کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے، پنپ نہ سکی۔ چھوٹی سی عمر سے دوپٹہ اوڑھنا، جھک کر سلام کرنا، شادی بیاہ کے ذکر پر شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھاڑ کر پڑنے ہی نہ دی۔ سوائے عظیم بھائی کے سب ہی گھر میں چاق و چوبند تھے۔ کنبہ کا کنبہ حد درجہ باذاق اور باتونی، آپس میں چونچیں چلتیں، نئے نئے جملے تراشے جاتے، ایک دوسرے کی دھجیاں اڑائی جاتیں، بچے بچے کی زبان پر سان رکھ جاتی۔

ابا پنشن لے کر آگرہ کے موروثی گھر میں رہنے لگے۔ کھلی ہوا میں اڑنے کے بعد ایک دم سے نہایت بوسیدہ

ماحول کی گھٹن سے واسطہ پڑا۔ کہاں فٹ بال اور گلی ڈنڈا اور کہاں آگرہ محلہ پنجہ شاہی کی بوسیدہ گلیاں اور ان گھٹی ہوئی گلیوں میں پلنے والی جھکی جھکی نیم بدقوق لڑکیاں جو اپنے دل کی دھڑکن سے سہم جاتیں۔ میری ان لڑکیوں سے بالکل نہ بنی اور ان بڑھیوں سے بھی ٹھن گئی جو مجھے چھچھوں پر قلانچیں بھرتا دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتیں۔

'نوج ہوا، نچھو کی لونڈیا ہے کہ موا بجار توبہ توبہ'

اور میری اماں جان نصرت خانم جنھیں لوگ پیار سے نچھو کہتے تھے۔ شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتیں۔

اور آگرہ کی ان مردہ گلیوں میں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ عورت خدا نے کیوں پیدا کی۔ مری پٹی مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت، دھوبن روز رات کو پٹتی تھی۔ مہترانی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے۔ پاس پڑوس کی تمام ہی عورتیں آئے دن اپنے شوہروں کے جوتے کھایا کرتی تھیں اور میں خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتی۔ اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنا دے کہ میں بھی چھت پر پتنگ اڑانے پر نہ پٹوں۔ گلیوں میں کبڈی کھیل سکوں اور آزادی سے بندروں کے پیچھے بھاگتی پھروں مگر آگرہ میں گندی گلیاں ہی نہ تھیں ان گلیوں میں سارے دور اور قریب کے رشتہ دار بھی رہتے تھے جن سے اماں لڑا کرتیں۔ جب تک دوسرے شہروں میں رہے آزاد رہے اپنے کنبہ میں آ کر تو جیسے بیڑیاں پڑ گئیں۔

مگر مجھے آگرہ کی ان شرمیلی دبی دبائی لڑکیوں سے مجبوراً بہنا پا جوڑنا پڑا اور مجھے معلوم ہوا کہ ہر میں بھولی نظر آنے والی لڑکیاں بڑی چلتی پرزہ ہیں۔ چھپ کر وہ گل کھلائے جاتے ہیں کہ الٰہی توبہ۔ بڑھیوں کو چنلیوں میں الو بنا کر گلی کے لونڈوں سے خوب خوب پینگیں بڑھتی ہیں۔ مجھے اس دوغلی زندگی سے بڑی کراہت آئی۔

آگرہ کی مکروہ فضا سے جلد ہی پیچھا چھوٹ گیا اور ہم لوگ علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ اماں کو بھی خاندان والوں سے وحشت ہوتی تھی۔ علی گڑھ کی کھلی ہوا میں پھر ہماری پرانی زندگی لوٹ آئی..... وہی پھوس کے بنگلے ڈگی کا کنارہ اور ہرے بھرے کھیت اور ان کھیتوں میں ککڑیاں، کھیرے چرانا، پیڑوں پر چڑھنا اور پھر مجھے اپنے لڑکی ہونے کا غم نہ رہا۔ بلکہ لڑکی ہونے کے کچھ فائدے نظر آنے لگے مثلاً ابا کا حکم تھا کہ لڑکیوں کی چوٹی نہ کھینچی جائے اور نہ ان کی بالیوں میں انگلی ڈال کر جھٹکے دیئے جائیں۔ لڑکیاں اگر ماریں تو سرکار سے شکایت کی جائے۔ مناسب سزا دی جائے گی۔ لڑکیاں کہاں بس خاکسار ہی ایک لڑکی تھی، جس کی شکایتیں ابا حضور کے دربار میں آئے دن پیش کی جاتیں مگر بھائی اتنے بدنام ہو چکے تھے کہ عموماً سزا انہیں ملتی، الٹے ڈانٹ دیئے جاتے۔

علی گڑھ آکر عظیم بھائی کے وجود کا احساس دن بدن بڑھنے لگا۔ خدا جانے انہیں مجھ سے کیوں ایک دم دلچسپی پیدا ہوگئی مجھے تو بڑے بھائی نسیم ہمیشہ سے اچھے لگتے تھے، ان سے مار کھانے میں بھی مزا آتا تھا، کیونکہ وہ پیسے اور مٹھائیاں بھی تو دیتے تھے۔ عظیم بھائی نہ پیسے دیتے نہ چپتیں مارتے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے بات کرتے۔

اور پھر انہوں نے مجھے تاریخ اور انگریزی پڑھانا شروع کی۔ یہ یاد نہیں رہا کہ ابتدا کیسے ہوئی۔ مگر اتنا یاد ہے کہ شام کو جب وہ کام سے تھکے ہارے آتے تھے تو اپنے برآمدے میں پلنگ پر لیٹ جاتے تھے اور مجھ سے کہتے زور زور سے پڑھو۔ پھر ترجمہ درست کرتے املا لکھواتے اس کے بعد باتیں کیا کرتے۔ یاد نہیں کیا باتیں تھیں جن سے ابتدا ہوئی۔ بعد میں تو حدیث و قرآن کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ ان کا پڑھانے کا طریقہ عجیب تھا۔ کوئی ناول دیتے کہ اس کا ترجمہ کر ڈالو انگریزی سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں۔ دس دس صفحے ترجمہ کروا ڈالتے۔ ناولوں کو ترجمہ کرنے میں کئی فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ پوری ناول کا ترجمہ کرنے سے پہلے ناول ختم کرنا پڑتی تھی اور اسی زمانہ سے مجھے شدت سے ناولیں پڑھنے کا چکر پڑ گیا۔ ساری ساری رات ناولیں پڑھیں، خاک پلے نہیں پڑا۔ لہٰذا پھر پڑھنا پڑیں۔ ہارڈی وہ پہلا ناولسٹ تھا جسے میں نے بقول عظیم بھائی گھول کر پی لیا تھا۔

اس زمانہ میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں بالکل ان کی آواز بازگشت بن گئی۔

'منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔' جب میں بولتی تو سب چڑاتے کہ یہ میں نہیں عظیم بھائی بول رہے ہیں، اور عظیم بھائی نے میری ناسمجھی سے فائدہ اٹھایا وہ بات جو وہ خود نہ کہہ پاتے۔ بڑی ہشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں پھٹ سے کہہ دیتی۔ اس دور میں بقول خاندان والوں کے انہوں نے مجھے خوب بھڑکایا۔ میری طبیعت جو پہلے ہی خودسر اور ضدی تھی ان کی شہ پاکر اور بھی قابو سے باہر ہوگئی۔

وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانہ میں نوکری بھی کرتے تھے۔ مضمون بھی لکھا کرتے تھے۔ اس قدر محنت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی گھنٹے پڑھایا کرتے۔ کبھی انہیں حرارت ہو جاتی، کبھی سینے میں درد ہوتا۔ ہاتھ پیر اینٹھتے، ان کی بیوی بیٹی ان کی چھاتی سینکا کرتیں۔ اور وہ مجھے پڑھایا کرتے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے سر یا پیر دبانے کو نہیں کہا۔ اور میں نے بھی کبھی ان کا کوئی کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بڑے بھائی جو تھے۔ اس لیے مجھے پڑھانا تو ان کا فرض تھا۔ ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ دو گھنٹے

گئے اور چند صفحوں کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا۔ مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

'ہم نہیں پڑھتے آپ سے، آپ تو اتنا کھانستے ہیں۔' میں نے جل کر کہا۔

'بیوقوف کہیں کی، کیا ہم جان بوجھ کر کھانس رہے ہیں۔' انہوں نے ہنس کر کہا اور وعدہ کیا کہ اب نہیں کھانسیں گے۔

پتہ نہیں انہیں میرے مستقبل سے کیوں دلچسپی ہوگئی تھی۔ میٹرک کرنے پر تو اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوئے ہوں گے، چھٹیوں میں انہوں نے مجھے اپنے گھر بلالیا۔ چونکہ اب وہ جودھ پور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انہوں نے مجھے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی۔

اور شاید کیا بلکہ قطعی میں نے ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی چھپا کر لکھنا شروع کر دیا۔ حجاب اسمٰعیل، بھنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سب کچھ میرے ہی اوپر بیت رہی ہے اور پھر میں نے خود کو افسانہ کی ہیروئین تصور کر کے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کیے۔

مثلاً میں بہت خوبصورت ہوں، بالکل حجاب اسمٰعیل کی ہیروئن کی طرح سنہری بال نیلی آنکھیں..... قرمزی رنگ کا لبادہ اوڑھے نیم دراز ہوں، ہیرو آتا ہے..... میرا پہلا ہیرو ہمیشہ ڈاکٹر ہوتا تھا، شاید اس لیے کہ اس زمانہ میں ڈاکٹر ہی ایسا غیر مرد ہوتا تھا جو گھر میں آکر نبض ٹٹول سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر لازمی طور پر بہت حسین ہوتا تھا۔ رات بھر میرے سرہانے بیٹھا رہتا۔ میری حالت خراب ہونے پر زار و قطار روتا، بے تابانہ مجھے چومتا اور میری حسین موت پر ڈاڑھیں مار کر روتا اور عموماً خودکشی کر لیتا۔ کیا مزے دار ہوا کرتی تھیں یہ کہانیاں۔ انہیں لکھنے میں اتنا ہی لطف آتا تھا جیسا چٹ پٹی کہانیاں پڑھنے میں آتا ہے۔ عموماً ایسی کہانیاں لکھ کر میں فوراً پھاڑ ڈالا کرتی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ 'گندی' ہیں اور اگر کسی نے پڑھ لیں تو وہ جوتہ کاری ہوگی کہ بس۔

مگر نہ جانے کیوں پھر لکھ کر دوبارہ تبارہ پڑھنے میں لطف آتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے میں نے نہیں کسی اور نے لکھی ہے۔ اور واقعی وہ میری تصنیف نہ تھی اور نہ میرا روزنامچہ تھیں بلکہ وہ ان کہانیوں کا نچوڑ تھیں، جو مجھے بھا چکی تھیں۔

ایسی کہانیوں کا میرے سرہانے انبار جمع ہوگیا اور وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔

ایک دن شمیم جو عمر میں مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے ہیں، میرے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سرہانے کا غذ سرسرائے تو نکال کر پڑھنے لگے 'آہاہا..... بھتنی نے کیا گندی گندی باتیں لکھی ہیں، توبہ توبہ۔'

شمیم نے زور زور سے پڑھنا شروع کیا۔

میں پاس ہی غسل خانے میں نہارہی تھی، سر میں بیسن ڈال چکی تھی اُفوہ بیان نہیں کرسکتی کہ کیا حالت ہوئی......
یا خدا اگر ایک سطر اور آگے پڑھ لی تو پھر ڈوب مرنے کے سوا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔

ہیبت زدہ ہوکر میں نے غسل خانہ سے وہ زور زور کی چیخیں ماریں کہ سارا گھر ہل گیا۔ لوگ سمجھے شاید موری سے سانپ نکل آیا اور مجھے ڈس لیا۔ شمیم بیچارہ کاغذ پھینک پھانک میری جان کی خیر منانے لگا۔ میں نے الٹے سیدھے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر شمیم کا منہ نوچ ڈالا۔ وہ بے چارا ہونق منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ آگے اسے پڑھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ خود میری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، میں نے اسی وقت سارا پلندہ جلا کر خاک کردیا۔ شمیم نے بہت کہنے کی کوشش کی کہ میں نے نہایت گندی کہانیاں لکھی تھیں مگر میں نے جھٹلا دیا کہ ٹرانسلیشن تھا۔ وہ بیچارہ پرلے درجہ کا جھوٹا مشہور تھا۔ اس لیے کسی نے بھی نوٹس نہ لیا۔

اب اس خیال سے کوفت ہوتی ہے کہ اگر بجائے شمیم کے کوئی دوسرا بھائی پڑھ لیتا تو واقعی قیامت آجاتی بس اس دن سے میں نے توبہ کی کہ اول تو ایسی بیہودہ کہانیاں لکھوں گی ہی نہیں اور اگر لکھوں بھی تو فوراً پھاڑ ڈالوں گی۔
حالانکہ اب اگر غور کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ ان کہانیوں میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

پھر کئی سال کچھ نہیں لکھا۔ بی اے کے بعد دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ چار سال میں انسان کتنا بڑا ہوجاتا ہے۔
میٹرک کے بعد چار سال میں نے کورس کی کتابیں مجبوراً پڑھیں۔ یونانی ڈرامہ چشن چلے اور شیکسپیئر سے لے کر ابسن اور برنارڈ شا تک بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ برنارڈ شا نے میرا دل مٹھی میں لے لیا۔ میں نے اپنا پہلا مضمون یا ڈرامہ 'فسادی' برنارڈ شا سے حد درجہ متاثر ہوکر لکھا۔ مواد میں نے اپنے اردگرد سے لیا۔ اور اینٹ گارا برنارڈ شا سے سیکھا۔
بی ٹی کلاس میں میری ہم جماعت عذرا حیدر مجھے برنارڈ شا کہہ کر خوب چڑایا کرتی۔ اس لیے میں نے فوراً برنارڈ شا کے شکنجہ سے نکل کر کہانیاں لکھنا شروع کیں۔

اور زندگی کے اس دور میں مجھے ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا موقع ملا۔ جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔
روشن آنکھوں اور مسکراتے شگفتہ چہرے والی رشیدہ آپا سے کون ایسا تھا کہ ایک دفعہ مل کر بھنا نہ جائے۔

پہلی دفعہ میں نے انہیں نہ جانے کون سے جلسے میں دیکھا تھا۔ بیگم بھوپال صدارت کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کڑکڑاتے جاڑے میں بیویاں موٹے موٹے دوشالے اور کوٹ ڈالے پنڈال کے اندر سوسوں کررہی تھیں اور

رشیدہ آپا بغیر آستین کا بلاوز پہنے دھواں دھار کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کے سیاہ بھونرا اور گھنگھریالے بال ہوا میں اڑ رہے تھے کیونکہ تقریر شروع کرنے سے پہلے انہوں نے سامنے کی کھڑکی کھول دی تھی۔ بیویاں بڑبڑا رہی تھیں۔ ان کے کٹے ہوئے بالوں پر بغیر آستین کے بلاوز پر اور کھلی ہوئی کھڑکی میں سے آتی ہوئی برفیلی ہوا پر۔ مگر ان کی تقریر بھی شاید کچھ کم خاردار نہیں تھی۔ کیونکہ تقریر کے بعد انہیں بیگم بھوپال نے خوب ڈانٹا۔ اس دن ان کی بے حیائی اور بیبا کی کا تہلکہ مچ گیا تھا اور میں نے بے سمجھے بوجھے ان کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر پہن لیا تھا۔ ۳۸ء میں رشیدہ آپا انگاروں والی رشیدہ آپا بن چکی تھیں۔ اب ان کی سلگتی ہوئی باتیں پلے بھی پڑنے لگی تھیں۔

اور پھر وہ میرا حسین ڈاکٹر ہیرو، شمعی انگلیاں، نارنگی کے شگوفے اور قرمزی لبادے چھو ہو گئے۔ مٹی سے بنی ہوئی رشیدہ آپا نے سنگِ مرمر کے سارے بت منہدم کر دیئے۔

زندگی ننگی چم سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ان سے گھنٹوں باتیں کر کے بھی جی سیر نہ ہوتا تھا۔ انہیں کھا جاؤں، کیا کروں جو رشیدہ آپا سے مل چکے ہیں۔ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں، اگر وہ میری کہانیوں کی ہیروئن سے ملیں تو دونوں جڑواں بہنیں نظر آئیں۔ کیونکہ انجانے طور پر میں نے رشیدہ آپا ہی کو اٹھا کر افسانوں کے طاقچہ میں بٹھا دیا کہ میرے تصور کی دنیا کی ہیروئن صرف وہی ہو سکتی تھیں مگر جب غور سے اپنی کہانیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے صرف ان کی بے باکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لیا۔ ان کی بھرپور سیمابی شخصیت میرے قابو میں نہ آئی۔ مجھے روتی بسورتی حرام کے بچے جنتی ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی وفا اور وہ جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا میرے مذہب میں جائز نہیں۔ عشق مقوی دل و دماغ ہے نہ کہ جی کا روگ۔

یہ سب میں نے رشیدہ آپا سے سیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ رشیدہ آپا جیسی لڑکی سولڑکیوں پر بھاری پڑ سکتی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد سوائے فسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا۔ ملک بکھرا، دنیا بکھری اور اس کے ساتھ کتنی ہی حسین و نازک قدریں چور چور ہو گئیں۔ مقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑبڑا دیا۔ کیوں لکھیں اور کیا لکھیں؟ کے مخمصہ میں پڑ کر اور بھی راستہ گم ہو گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹا دیا۔ کتنے نئے ساتھی ملے اور پرانے بچھڑ گئے اور پھر۔

انجمن کے پرخچے اڑ گئے۔ بمبئی گروپ جس کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھا کرتی تھیں، فلموں میں غرق ہوگیا۔ ظاہر ہے صرف رسالوں کے لیے لکھ کر روزی نہیں کمائی جاسکتی۔ نہ ناولیں اور افسانوں کے مجموعوں سے بمبئی کا خرچہ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ہاتھ لگ جائے تو قلم چلا کر روٹی کا سہارا ہوسکتا ہے۔

فلموں کے لیے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بیبا کی کی دھونس چلتی ہے نہ صاف گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چیز چاہیے جو چھپر پھاڑ کر دولت لائے۔ یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہوگا۔ لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

فسادات کے بارے میں تجربہ سنی سنائی سے آگے نہ بڑھ پایا۔ 'دھانی بانکیں' اور جڑیں سے زیادہ نہ محسوس کر پائی اور نہ لکھ پائی مگر ان دو مضامین کو لکھتے وقت میرے دل نے بڑے زور سے قلابازی لگائی۔ اس وقت تک میں نے جتنی کہانیاں لکھی تھیں۔ ان میں ماں باپ یا تو تھے ہی نہیں اگر تھے تو نہایت فضول سی شے۔ انہیں نظر انداز کر کے ہی میری دانست میں ان پر فتح پائی جاسکتی ہے۔ والدین سڑک کا روڑا ہی تو ہیں جو اولاد کے راستہ میں رکاوٹوں کے سوا کچھ نہیں پیدا کرتے۔ 'یہ نہ کرو، وہ نہ کرو' اب تک میرے دماغ میں بسا ہوا تھا لیکن یہ دو مضمون لکھتے وقت میں نے اپنی ماں کو دیکھا۔

سب انہیں اکیلا چھوڑ کر پاکستان جا چکے تھے۔ میں ان سے ملنے جودھ پور گئی۔ اماں ہمارے ذاتی مکان کے سامنے ایک مختصر سے کمرے میں منتقل ہوگئی تھیں۔ ہمارا اپنا وسیع مکان رفیوجیوں کے قبضہ میں تھا۔

میں پہنچی تو ڈھنڈھارا اجڑے ہوئے کمرے میں اماں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اماں کو ہم لوگوں کو چومنے چاٹنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔ مجھے نہیں یاد اس سے پہلے کبھی انہوں نے محبت کا اظہار کیا ہو۔ مگر اس وقت مجھے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اپنے قیام کے زمانے میں بار بار میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑکی سے اپنے گھر کو تک رہی ہیں۔ جہاں بھرے پرے خاندان کے ساتھ ہم سب ہنسی خوشی رہتے تھے۔ بچے قلانچیں بھرتے تھے، لڑائیاں ہوتی تھیں، ملاپ ہوتے تھے۔

میں نے ان کی عمر کی طرف دیکھا، اس اکیلے پن کو دیکھا۔ موٹے موٹے دس بچے پیدا کر کے بھی وہ اکیلی تھیں۔

میرے دل میں پیار کا طوفان ابل آیا۔ مامتا جاگ اٹھی۔ میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی بچی کی طرف دیکھا اور ان دو ہستیوں کے بیچ میں خود کو جکڑا ہوا پایا۔ اپنی ماں کو دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ ساری دنیا کی بڑھیوں پر پیار آنے لگا جو دنیا کو بساتی ہیں۔ مر مر کر جنم دیتی ہیں، انہیں پالتی پوستی ہیں، جو سب کچھ ان پر نچھاور کرتی ہیں نہ ان سے اسٹامپ لکھاتی ہیں نہ پکے کاغذ پر رسید۔ اب اگر اولاد ان کے بڑھاپے کا خیال کرلے تو فرماں بردار ہے جو اپنے بال بچوں کے خرچہ سے کچھ نہ بچے تو مجبور ہے۔ پرانے زمانے میں بڑے بوڑھوں کو لوگ بیکار جنس سمجھ کر زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ یہ سنسان بڑھاپا کس قدر مہیب شے ہے۔

اور یہ بھی اتفاق ہی تھا جو میری اپنی اماں سے ملاقات ہوگئی اور کچھ سوئے ہوئے تار جاگ اٹھے۔ ابھی کتنے تار ہیں جو مردہ خاموش سوئے پڑے ہیں۔ کون جانے کون سے مضراب اور پیدا ہوں گے جن کی چوٹ سے بہت سی نیندیں ٹوٹیں گی۔ ٹھہرے ہوئے پانی پر کائی جم جاتی ہے، ایک ننھا سا کنکر سطح پر گرتا ہے...... کائی چھٹ جاتی ہے...... جگمگاتی دنیا کا عکس پانی کی سطح پر لودینے لگتا ہے۔ انسان ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔

لفظ و معنی

جمِ غفیر ۔ بہت بڑی بھیڑ
پاپیادہ ۔ پیدل
مدقوق ۔ دق زدہ، ٹی بی کا مریض
محکوم ۔ مجبور، جس پر حکم چلایا جاتا ہے
خودسر ۔ اپنی رائے پر چلنے والا، گھمنڈی
شہ پاکر ۔ اشارہ پاکر
ہیبت زدہ ۔ خوفناک، گھبرایا ہوا
خاردار ۔ کانٹوں سے بھرا ہوا
واویلا ۔ ہنگامہ، شور
سیمابی شخصیت ۔ بے چین، بے قرار شخصیت
مخمصہ ۔ الجھن

پرچے ۔ ٹکڑے

مضراب ۔ ستار پر ضرب لگانے کا ٹکڑا، تاروں کو چھیڑ کر آواز پیدا کرنے والا لکڑی کا ٹکڑا

آپ نے پڑھا

- عصمت چغتائی نے اپنی آپ بیتی میں اس ماحول کی خاص طور پر عکاسی کی ہے جس میں انہیں ایک منفرد فن کار کی حیثیت سے ابھرنے کا موقع ملا، والدین اور بھائی بہنوں کا خصوصی ذکر ہے۔ ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے زمانے میں سب سے زیادہ اثرات رشید جہاں سے حاصل کیے ہیں۔ رشید جہاں کے خیالات اور ان کی شخصیت عصمت چغتائی کے ذہن میں ہمیشہ ایک مثال بنی رہی۔ ان کے علاوہ وہ اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی سے بھی خاصی متاثر رہی ہیں۔
- عصمت چغتائی نے اپنی مختصر آپ بیتی میں اپنے خاندانی حالات بھی پیش کر دیے ہیں۔ اپنے عہد کی ادبی سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا ہے، اپنی تعلیم و تربیت، معاصرین سے تاثرات، اپنی پسند و ناپسند، اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی حالات — غرض ان تمام باتوں کا ذکر کر دیا ہے جو خود ان کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

آپ بتائیے

1. عصمت چغتائی کی والدہ کا نام کیا تھا؟ انہیں لوگ پیار سے کس نام سے پکارتے تھے؟
2. 'انگارے' کی مولف و مرتب کون تھیں؟
3. عظیم بیگ چغتائی سے عصمت چغتائی کا کیا تعلق تھا؟
4. مندرجہ ذیل محاورات و اشارات کے معنی بتائیے۔

   قلانچیں بھرنا، گز بھر کی زبان، گھول کر پی لینا، شہ پانا، ہاتھ دھو بیٹھنا، ناک کے بل چلنا
5. 'منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔' یہ بات عصمت چغتائی نے کس کے ذکر میں کہی ہے۔

مختصر گفتگو

1. رشید جہاں سے عصمت چغتائی کی پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟
2. رشید جہاں نے ترقی پسند ادب کے ترجمان کے طور پر جو کتاب مرتب کی تھی اس کا نام کیا ہے؟
3. عصمت چغتائی آخری بار اپنی والدہ سے کہاں ملی تھیں؟

4. عصمت چغتائی کے والد پنشن لے کر کہاں رہنے لگے تھے؟

تفصیلی گفتگو

1. عصمت چغتائی رشید جہاں کی شخصیت سے کیوں متاثر تھیں؟
2. عصمت چغتائی کی شخصیت کے چند اہم پہلوؤں کی وضاحت کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. عصمت چغتائی کے بارے میں مزید کچھ باتیں جاننے کی کوشش کریں۔
2. عصمت چغتائی کے مشہور افسانوں کے بارے میں اپنے اساتذہ سے دریافت کیجیے۔